علاماتِ قیامت کی دو قسمیں اور ان کا بیان

علماءِ کرام نے علاماتِ قیامت کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے: 1 علاماتِ قریبہ اور 2 علاماتِ بعیدہ علاماتِ قریبہ سے مراد وہ علامات ہیں جو قیامت کے بالکل نزدیک رونما ہونگی، بلکہ بعض تو قیامت کے ساتھ متصل ظاہر ہونگی، ان علامات میں خروجِ دجال، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام خروجِ یاجوج وماجوج، خروجِ دابۃ الارض، خروج النار اور طلوع الشمس من المغرب وغیرہ ہیں۔ جبکہ علاماتِ بعیدہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ووفات، اور ظہورِ فتن وغیرہ ہیں۔ کچھ علماء نے ایک تیسری قسم کا بھی ذکر کیا ہے، یعنی: علاماتِ وسطیٰ، مثلاً: علم کا اٹھ جانا اور جھل کا پھیل جانا، قتل وغارت گری، تقارب اسواق، تقارب ازمان وغیرہ وغیرہ۔

حدیثِ جبریل میں مذکور علامات کا بیان حدیثِ

جبریل میں قیامت کی دو علامتوں کا ذکر ہے: 1 (أن تلد الأمۃ ربتھا) یعنی: لونڈی اپنے آقا کو جنے۔ یہ کثرتِ فتوحات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، چنانچہ ایک شخص اپنی لونڈی سے ہمبستری کرے گا، اور وہ اس کیلئے بچہ جنے گی، یوں وہ لونڈی اپنے آقا کے بچے کی ماں کہلائے گی جسے اُم ولد کہا جاتا ہے، بچہ کا باپ چونکہ اس لونڈی کا آقا ہے، اس تعلق سے اس کا بیٹا بھی اس کا آقا ہی شمار ہوگا۔

یا پھر اس جملہ سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ احوال بڑی تیزی سے متغیر ہونگے اور اولاد اپنے ماں باپ کی نافرمان بنتی جائے گی، نافرمانی اس حد تک بڑھ جائے گی اور بچے اپنے والدین پر یوں حکم چلائیں گے کہ محسوس ہوگا کہ اولاد اپنے ماں باپ کی آقا ہے۔ 2 (وأن ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون في البنيان) یعنی: اور تو دیکھے ننگے پاؤں، ننگے جسموں والے فقیروں کو، نیز بکریوں کے چرواہوں کو، بڑی بڑی عمارتوں میں فخر کرنے والے۔ (الحفاۃ): حافی کی جمع ہے، جس کا معنی: ننگے پاؤں۔ (العراۃ): عاری کی جمع ہے، جس کا معنی: ننگے بدن۔ (العالۃ): عائل کی جمع ہے، جس کا معنی: فقیر۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں پہننے کو جوتا تک میسر نہ تھا، بدن کافی لباس سے محروم تھا، اور معیشت انتہائی فقر کے ساتھ بسر ہوتی تھی، مویشی چَرا کر تھوڑا بہت گذارہ کر لیا کرتے تھے، یکلخت ان کے

احوال تبدیل ہو جائیں گے،اور وہ شہروں میں بڑی بڑی بلڈنگوں کے مالک بن جائیں گے،بلکہ عمارتوں کی بلندی پر ایک دوسرے سے سبقت لیجانے اور فخر کرنے کی کوشش کریں گے۔

شیخ عبدالمحسن العباد حفظہ اللہ فرماتے ہیں: وھاتان العلامتان قد وقعتا یعنی: یہ دونوں علامتیں واقع ہو چکی ہیں۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمارے اس دور میں عمارتوں کے ذریعہ فخر کا سلسلہ بہت بڑھ گیا ہے، اگرچہ یہ تفاخر ہر دور میں رہا ہے، اور ہر دور کے لوگ اپنے دور کے تفاخر کو علامتِ قیامت ہی قرار دیتے رہے ہیں۔ واللہ اعلم

الفصل الأول علامات الساعة الصغرى

أولًا: بعثة النبي محمد –صلى اللَّه عليه وسلم–

عن سهل بن سعد –رضي اللَّه عنه–: "رأيت رسول اللَّه –صلى اللَّه عليه وسلم– قال بأصبعيه هكذا الوسطى والتي تلى الإبهام، وقال: بعثت أنا والساعة كهاتين" رواه البخاري ومسلم

ثانيا: موته –صلى اللَّه عليه وسلم–

عن عوف بن مالك –رضي اللَّه عنه– قال: "أتيت النبي –صلى اللَّه عليه وسلم– في غزوة تبوك وهو في قبة من أدم، فقال: أعدد ستًا بين يدي الساعة: موتى(رواه البخاري)

ثالثًا: انشقاق القمر

قال تعالى. {اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (1) وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ (2)} [القمر: 1 – 2].

قال ابن كثير: {وَانْشَقَّ الْقَمَرُ} قد كان هذا في زمان رسول الله –صلى الله عليه وسلم– كما وورد ذلك في الأحاديث المتواترة بالأسانيد الصحيحة، وهذا أمر متفق عليه بين العلماء؛ أي: إنشقاق القمر، وأنه وقع في زمان النبي –صلى الله عليه وسلم–، وأنه كان إحدى المعجزات الباهرات (تفسير بن كثير.

روى الشيخان عن عبد الله بن مسعود –رضي الله عنه–؛ قال: "انشق القمر على عهد رسول الله –صلى الله عليه وسلم– شقتين، فقال النبي –صلى الله عليه وسلم–: اشهدوا"

رابعًا: فتح بيت المقدس وطاعون عمواس

قال النبي صلى الله عليه السلام "أعدد ستًا بين يدي الساعة: موتى، ثم فتح بيت المقدس، ثم موتان يأخذ فيكم كعقاص الغنم.(رواه البخاري)

خامسًا: استفاضة المال وإخراج الأرض كنوزها

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله –صلى الله عليه وسلم–قال: ". . . وحتى يكثر فيكم المال فيفيض حتى يهم رب المال من يقبل صدقته، حتى يعرضه فيقول الذي عرض عليه: لا أرب لي فيه. . . "

سادسًا: قتل الإمام

قال النبي –صلى الله عليه وسلم–: "والذي نفسى بيده، لا تقوم الساعة حتى تقتلوا إمامكم، وتجتلدوا بأسيافكم، ويرث دنياكم شراركم" رواه الترمذي وقال: حسن ورواه ابن ماجه في الفتن

سابعًا: اقتتال فئتين عظيمتين من المسلمين دعواهما واحدة

1 – روى أحمد والشيخان وأبو داود والترمذي عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي –صلى الله عليه وسلم– قال: (لا تقوم الساعة حتى يقتتل فئتان، فكون بينهما مقتلة عظيمة، دعواهما واحدة. . .)

ثامنًا: خروج الكذابين أدعياء النبوة

1 – عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله –صلى الله عليه وسلم– قال: (لا تقوم الساعة حتى يقتتل فئتان عظيمتان. . .، وحتى يبعث دجالون كذابون، قريب من ثلاثين كلهم يزعم أنه رسول الله، وحتى. . . إلخ)

تاسعًا: وضع الأحاديث المكذوبة على رسول الله –صلى الله عليه وسلم–

– عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله –صلى الله عليه وسلم–: (يكون في آخر الزمان دجالون كذابون، يأتونكم من الأحاديث بما لم تسمعوا أنتم ولا آباؤكم، فإياكم وإياهم، لا يضلونكم ولا يفتنونكم)

وفي رواية أخرى قال: (سيكون في آخر أمتي أناس يحدثونكم ما لم تسمعوا أنتم ولا آبائكم، فإياكم وإياهم)

عاشرًا: ظهور الخوارج

عن أبي ذر –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله –صلى الله عليه وسلم–: (إن بعدي من أمتي –أو سيكون بعدي من أمتي قوم يقرؤون القرآن لا يجاوز حلاقيمهم، يخرجون من الدين كما يخرج السهم من الرقبة، ثم لا يعودون فيه، هم شر الخلق والخليقة)

الفصل الأول علامات الساعة الكبرى

تمهيد

بعد ذكر علامات الساعة الصغرى وما يتخللها من الفتن وتغير الأحوال واضطراب الموازين، اذكر في هذا الفصل وما بعده العلامات الكبرى، وأول هذه العلامات ظهور المهدى، ومن العلماء من يعتبر خروج الدجال أول العلامات الكبرى، على خلاف بينهم، وعلامات الساعة الكبرى على نوعين: مألوفة وغير

مألوفة أما العلامات المألوفة فهي: ظهور المهدى، خروج الدجال، نزول عيسى بن مريم من السماء، خروج يأجوج ومأجوج، وهذه كلها أمور اعتيادية في ظاهرها، لأنهم بشر عاديون.

أما العلامات غير المألوفة فهي: طلوع الشمس من المغرب لا من جهتها التي اعتاد الناس عليها منذ خلق البشرية، وخروج الدابة التي تكلم الناس إلى آخر ذلك من الآيات التي توحى باضطراب في الأمور مذهل للبشرية.

قال ابن حجر في الفتح: (والذى يترجح من مجموع الأخبار، أن خروج الدجال أول الآيات العظام المؤذنة بتغير الأحوال العامة في معظم الأرض، وينتهى ذلك بموت عيسى عليه السلام، وأن طلوع الشمس من المغرب هو أول الآيات العظام الموذنة بتغير أحوال العالم العلوى وينتهى ذلك بقيام الساعة)

حدیث جبریل کاآخری حصہ

(ثم انطلق فلبثت مليا ثم قال لی:يا عمر أتدری من السائل؟قلت: الله ورسوله اعلم ،قال:فإنه جبريل أتاكم يعلمكم دينكم)

یعنی: پھر وہ شخص چلا گیا، میں کچھ عرصہ (تین دن) ٹھہرا، پھر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! کیا جانتے ہو یا سائل کون تھا؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ سائل جبریل امین علیہ السلام تھے جو تمہارے پاس تمہیں، تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ ایک حدیث میں آتاہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت صحابہ کرام کوآگاہ فرمادیا تھاکہ یہ سائل جبریلعلیہ السلامہیں، جبکہ اس حدیث میں (ملیا) کا لفظ ہے، جس کی تفسیر بیشتر علماء نے تین دن سے کی ہے، بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعارض دکھائی دے رہاہے۔ یہاں جمع اور تطبیق کی صورت ممکن ہے، اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام حاضرین کو اسی وقت یہ بتادیا تھا کہ یہ سائل جبریلعلیہ السلامہیں، ممکن ہے جناب عمر رضی اللہ عنہ اس وقت مجلس سے جاچکے ہوں، بعد میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ خبر دی ہو۔ خاتمہ (حدیثِ جبریل سے حاصل ہونے والے کچھ فوائد) شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث بہت سے فوائد

پر مشتمل ہے، اگر کوئی شخص اس حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد خواہ منطوقاً ہوں یا مفہوماً یا اشارۃً کا استنباط کرنا چاہے تو ایک بہت بڑی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے جو چند فوائد مستحضر ہیں، بالاختصار ان کا ذکر کیے دیتے ہیں۔ (شیخ کے ذکر کردہ فوائد کی تلخیص کے ساتھ ساتھ کچھ ہمارے زوائد بھی شامل ہونگے):

(۱) ہم نے حدیثِ جبریل میں پڑھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ خلق اور حسنِ تواضع کا ثبوت ہے، آپصلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنے آپ کو کسی منفرد مقام کا حامل نہیں سمجھتے تھے نہ ہی اپنے آپ کو ان سے فوقیت والا شمار کیا کرتے تھے۔ احادیث میں تو یہاں تک ملتا ہے کہ ایک لونڈی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر لاتی تاکہ آپ اس کی بکری کا دودھ دوھدیں، اسی معنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت الی المدینہ کے دوران، ام معبد الخزاعیہ کے خیمے میں جانے کا قصہ ملتا ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خیمے میں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ پائی، اور اس کی کمزور سی بکری دیکھی تو اپنے مبارک ہاتھ اس کے تھنوں پر پھیرے، اللہ تعالیٰ نے اس بکری سے دودھ جاری کر دیا، جو آپ نے ام معبد کو پلایا۔ واضح ہو کہ یہ تواضع بندے کے مقام کو گرانے یا گھٹانے کا سبب نہیں بنتی، بلکہ اس کی رفعت میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک بھی ہے: (من تواضع للہ رفعہ اللہ) یعنی: جو اللہ تعالیٰ کیلئے تواضع اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے بلندیاں عطا فرمائے گا۔

(۲) حدیثِ جبریل سے طلبۃ العلم کا اپنے شیخ کے ساتھ بیٹھنے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ نشست اخلاص پر مبنی ہو اور زیادہ سے زیادہ علمی استفادہ کا قصد ہو، محض وقت کا ضیاع مقصود نہ ہو۔

(۳) ملائکہ کے دوسری شکلوں میں متشکل ہونے کے امکان کا بھی علم ہوا؛ کیونکہ اس حدیث کے مطابق جبریل علیہ السلام اپنی شکل میں نہیں بلکہ انسانی شکل میں نمودار ہوئے تھے۔ البتہ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ فرشتوں کا کسی دوسری شکل میں متشکل ہونا ان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ ہے۔ اس واقعہ سے بعض

اہلِ ھوی نے بڑا بیہودہ استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ آج کل کے مروجہ ڈراموں کا جواز فراہم ہو رہا ہے؛ کیونکہ ڈراموں میں فنکار دوسری شکلیں دھار کر کسی کردار کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ انتہائی بودا استدلال بلکہ شبہ ہے، جس کی حیثیت تارِ عنکبوت سے بھی کمزور ہے؛ کیونکہ جبریلعلیہ السلامکا بصورتِ بشر آنا اللہ تعالیٰ کے امر سے تھا اور صدق وحق کی اساس پر تھا، جبکہ یہ ڈرامے فحش، کذب اور بیہودگی کا مرقع ہوتے ہیں، افسوس یہ ہے کہ یہ استدلال ان لوگوں کی طرف سے آیا ہے جو انبیاء کرام کی سیرتوں اور واقعات کو ڈرامائی رنگ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ عصرِ حاضر کا بہت بڑا فتنہ ہے، جس کی آڑ میں امت کو بے راہ روی، ذلت وضلالت کی آگ میں جھونکا جارہا ہے۔ فإنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

(۴) جبریل علیہ السلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انتہائی مؤدب ہو کر بیٹھنا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ شاگرد اپنے شیخ کے ادب کے تقاضے لازمی طور پہ سمجھتا ہو اور انہیں پورا کرتا ہو۔

(۵) جبریل علیہ السلام کا اپنی بات شروع کرتے ہوئے (یا محمد) کہنا، توریہ کے جواز کی دلیل بن سکتا ہے؛ کیونکہ (یا محمد) کہنے کا اسلوب اعرابیوں کا تھا اور جبریل علیہ السلام اپنے معاملہ کو مخفی رکھنے کیلئے ایک اعرابی ہونے کا تاثر دینا چاہتے تھے، کیونکہ متمدن افراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (یا محمد) کہہ کر ہرگز نہیں پکارا کرتے تھے۔

(٦) جبریل علیہ السلام نے پہلا سوال، اسلام کی بابت کیا، جس سے اسلام کی فضیلت اور اہمیت عیاں ہوتی ہے، اسلام کی تعریف کا پہلا نکتہ (لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ) کی شہادت ہے، اور یہی دعوتِ دین کا نکتہ آغاز ہے، اس لئے اسلام کی دعوت اور تعلیم ہر شئی پر مقدم ہے۔

(۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعریف میں پانچ امور کا ذکر فرمایا، انہی پانچ امور کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے، وہ پانچ امور حسب ترتیب یہ ہیں: شہادتین، نماز، زکوۃ، رمضان کے روزے اور حج بیت اللہ۔

(۸) شہادتین کے بعد نماز کا ذکر ہے، جو نماز کی اہمیت وفضیلت کی دلیل ہے اور اس امر کی متقاضی ہے کہ شہادتین کے بعد نماز ہی ہر رکنِ اسلام پر مقدم ہے۔

(۹) نماز کا ذکر (تقیم الصلاۃ) کے الفاظ کے ساتھ وارد ہے، جس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ نماز کو قائم کرنا ضروری ہے، محض پڑھ لینا کافی نہیں، اور نماز کے قائم ہونے کیلئے سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقہ کے مطابق ادا کی جائے، اور یہ مبارک طریقہ نماز کے تمام افعال پر منطبق ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: (صلوا کما رأیتمونی أصلی)

(۱۰) یہ بھی معلوم ہوا کہ زکوۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا بھی ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ اسلام کے پانچوں ارکان میں سے پہلے رکن یعنی (لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ) کی شہادت کا تارک بالاتفاق کافر ہے، بقیہ ارکان کے تارک کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء نے بقیہ ارکان کے تارک کو بھی کافر قرار دیا ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے، کچھ علماء تارکِ صلاۃ کی تکفیر کے قائل ہیں، جبکہ بیشتر علماء تارکِ صلاۃ کو کافر تو کہتے ہیں مگر کفر سے مراد عملی کفر لیتے ہیں۔ واللہ اعلم واضح ہو کہ اگر ایک شخص نماز کے وجوب کا منکر ہے تو وہ بالاجماع کافر ہے، خواہ وہ عملی طور پہ نماز پڑھتا ہو۔

(۱۱) حدیثِ جبریل سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان دو مختلف چیزیں ہیں؛ کیونکہ جبریل علیہ السلام نے پہلے اسلام کی بابت سوال کیا پھر ایمان کے متعلق۔ جو ان دونوں کے مابین تغایر کی دلیل ہے۔ البتہ اس کے متعلق سلف صالحین کی علمی مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تغایر اس وقت ہوگا جب اسلام اور ایمان کسی سیاق میں اکٹھے مذکور ہوں، اگر کہیں صرف ایمان کا ذکر ہو تو اسلام اس میں شامل ہوگا، اسی طرح اگر کہیں صرف اسلام کا ذکر ہو تو ایمان اس میں داخل ہوگا۔ مثلاً: قولہ تعالیٰ: [وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۰] اور قولہ تعالیٰ: [فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۰] میں صرف اسلام کا ذکر ہے، لہذا یہ ایمان کو شامل ہوگا۔ اور قولہ تعالیٰ: [وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ] اور قولہ تعالیٰ: [تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ] میں صرف ایمان کا ذکر ہے، لہذا یہ اسلام کو شامل ہوگا۔ جہاں ایمان اور اسلام اکٹھے مذکور ہونگے وہاں اسلام سے مراد اعمالِ

ظاہرہ ہونگے، جن کا تعلق زبان اور دیگر اعضاء سے ہو،اور ایمان سے مراد اعمالِ باطنہ ہونگے جن کا تعلق قلبی اعمال واعتقادات سے ہو۔ حدیثِ جبریل اسی تغایر و تفریق کی دلیل ہے۔اسی طرح قولہ تعالیٰ:[قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ] میں ایمان اور اسلام ایک سیاق کے تحت اکٹھے مذکور ہیں لہذا دونوں میں فرق ہوگا، صرف ترجمہ دیکھ لینے سے ہی یہ فرق مفہوم ہو جائے گا۔ ترجمہ: کہا اعراب نے ہم ایمان لے آئے، کہہ دو تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یہ کہو ہم اسلام لے آئے،اب تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔

(۱۲) ایمان کے چھ ارکان ہیں، جن کا بیان پچھلے صفحات میں ہو چکا،ان ارکان کا فہم انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے کماحقہ خوف کی طاقت مہیا کرے گا۔

(۱۳) چونکہ ایمان کے چھ ارکان کی خبر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، لہذا ان ارکان کا منکر کافر ہوگا، بلکہ ان میں سے کسی ایک رکن کا منکر بھی کافر ہوگا۔

(۱۴) ارکانِ ایمان میں سب سے مقدم رکن،ایمان باللہ ہے، یہ تمام معتقدات کا سردار ہے،اصلِ دین ہے،ایک مکلف کیلئے سب سے پہلا فریضہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی معرفت ہے،خواہ وہ توحیدِ ربوبیت ہو یا توحید الوہیت یا توحید اسماء وصفات۔ جس شدت اور قوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف انابت واخبات میں اضافہ ہوتا جائے گا،اس کا خوف بڑھے گا،اس ذات پر توکل قائم ہوگا۔ جس شخص کے ایمان باللہ میں کوئی کوتاہی پائی گئی اس کا کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا[ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ] بلکہ ایمان کے دیگر ارکان کا قبول بھی قطعاً مفید نہ ہوگا۔ وباللہ التوفیق

(۱۵) فرشتوں کا اثبات معلوم ہوا،ان پر بھی ایمان لانا واجب ہے، کچھ لوگ فرشتوں کو محض عقول قرار دیتے ہیں اور کچھ بغیر جسم کے روح سمجھتے ہیں، یہ دونوں قول باطل ہیں۔ حق یہ ہے کہ فرشتوں کے باقاعدہ جسم ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ] یعنی: (اللہ تعالیٰ) بنانے والا ہے فرشتوں کو جو کہ پَروں والے ہیں، اپنے نمائندے۔ فرشتوں کا پروں والا ہونا ان کے اجسام کی دلیل ہے۔ حدیث سے فرشتوں کے انتہائی وزنی ہونے کا ذکر بھی

ملتاہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:(اطت السماء وحق لها أن تئط ما من موضع أربع أصابع إلا وفيه ملک قائم لله وراكع أو ساجد) یعنی: آسمانوں میں (فرشتوں کی کثرت تعداد کی بناءپر بہت زیادہ وزن کی وجہ سے) چرچراہٹ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، چنانچہ آسمانوں میں چار انگلیوں کے برابر جگہ خالی نہیں ملتی، مگر وہاں فرشتہ موجود ہے، قیام کرتاہوا یا رکوع کرتاہوا یا سجدہ کرتاہوا۔ اس کے علاوہ احادیث سے جبریلعلیہ السلامکے چھ سوپروں کا ثبوت ملتاہے جواس بات کی دلیل ہے کہ فرشتے محض ارواح یا عقول کا نام نہیں بلکہ باقاعدہ اجسام ہیں۔ کچھ لوگ توفرشتوں کو نفسِ انسانی میں موجود خیر کی قوت قرار دیتے ہیں اور شیاطین کو نفسِ انسانی میں موجود شر کی قوت قرار دیتے ہیں، یہ قول سابقہ اقوال کے مقابلے میں بڑا باطل ہے۔

(۱۶) تمام آسمانی کتب وصحف خواہ ان کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہو یا نہ ہو پر ایمان لانا بھی ارکانِ ایمان میں سے ہے۔ کسی ایک کتاب کی تکذیب، تمام کتبِ ساویہ کی تکذیب قرار دی جائے گی۔

(۱۷) تمام انبیاء ومرسلین پر ایمان لانا بھی، ارکانِ ایمان میں سے ہے، اگر کوئی شخص صرف اپنے رسول پر ایمان لے آئے اور باقی تمام رسولوں کا انکار کردے تو اس کا اپنے رسول پر ایمان لانا بھی قابل قبول نہ ہوگا، بلکہ وہ شخص کافر قرار پائے گا، کسی ایک رسول کی تکذیب تمام انبیاء کی تکذیب کے مترادف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح کے بارہ میں فرمایا: [كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِ الْمُرْسَلِيْنَ] یعنی: قومِ نوح نے تمام رسولوں کا انکار کردیا۔ حالانکہ انہوں نے صرف اپنے رسول نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی مگر ان کی تکذیب، تمام انبیاء کی تکذیب قرار دی گئی۔

(۱۸) یومِ آخرت کا اثبات وایمان بھی، ارکانِ ایمان میں شامل ہے، یومِ آخرت سے مراد قیامت کا دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ حساب وکتاب کیلئے تمام لوگوں کو اٹھائے گا، اس حساب کے نتیجے میں اہلِ جنت، جنت میں اور اہلِ جہنم، جہنم میں ٹھکانہ پائیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا بیشتر حصہ آخرت اور قیامت کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف ہوا؛ کیونکہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار کی وجہ عقیدۂ آخرت قرار دی تھی، ان کے

بقول مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا محال ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے واضح دلائل وبراہین کی روشنی میں عقیدۂ آخرت پیش فرمایا، کچھ دلائل سابقہ صفحات میں گذر چکے ہیں۔

(۱۹) تقدیر پر ایمان لانا خواہ وہ خیر ہو یا شر، ارکانِ ایمان میں سے ہے، تقدیر پر مکمل ایمان اس شخص کا قرار پائے گا جو ان چاروں مراتب کو کماحقہ قبول کرلے، جن کا گذشتہ صفحات میں، تقدیر کی بحث میں بیان ہوچکا ہے، وہ مراتب یہ ہیں: 1 علم 2 کتابت 3 مشیئت 4 خلق، تفصیلات جاننے کیلئے گذشتہ صفحات میں مذکور تقدیر کی بحث کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۲۰) حدیث کے سیاق سے یہ علم ہوا کہ تقدیر خیر بھی ہے اور شر بھی، شر کے تعلق سے وضاحت گذر چکی، یہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ شر تقدیر میں نہیں بلکہ مقدور میں ہے، جس کی وضاحت یوں ہے کہ تقدیر چونکہ اللہ تعالی کے افعال کا نام ہے، لہذا وہ سب کے سب خیر ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:(والشر ليس إليك)یعنی: شر تیری طرف منسوب نہیں ہے، لہذا اللہ تعالی کی قضاء وقدر میں کوئی شر نہیں؛ کیونکہ وہ سب اللہ تعالی کی رحمت وحکمت سے صادر ہے، اور محض شر تو شریر سے صادر ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث میں تو خیر وشر دونوں کو تقدیر کہا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شر تقدیر میں نہیں بلکہ مقدورات ومخلوقات میں ہے؛ کیونکہ تقدیر اللہ تعالی کا فعل ہے وہ کیسے شر ہوسکتا ہے؟ ایک مثال سے اس کی وضاحت پیش کی جاتی ہے: اللہ تعالی کا فرمان ہے: [ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ]یعنی: خشکی وتری میں فساد ظاہر ہوا، بوجہ اس کے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔ اس آیتِ کریمہ میں زمین میں رونما ہونے والے فساد اور اس کے سبب کا ذکر ہے، (یہ فساد تقدیر میں لکھا ہوا ہے) آگے آیت کریمہ میں اس کی حکمت مذکور ہے، فرمایا:[لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ]یعنی: تاکہ لوگوں کو ان کی کچھ کرتوتوں کی سزا چھکائے، شاید کہ وہ دین کی طرف لوٹ آئیں۔ اب زمین میں ظاہر ہونے والے مصائب مثلاً: خشک سالی، فقر، بیماری وغیرہ تکلیف دہ امور ہیں، یہ کیوں رونما ہوئے؟ یہ لوگوں کی بداعمالیوں کی بناء پر رونما ہوئے۔ لیکن ان کا نتیجہ انتہائی خیر ہے، یعنی: لوگ کچھ سزا پاکر دین کی طرف لوٹ آئیں، تو اللہ تعالی کا یہ امرِ مقدر اگرچہ من وجہ لوگوں کیلئے اذیت کا باعث ہے، مگر انجامِ کار انتہائی بہترین ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تقدیر، اللہ تعالی کا فعل ہے جو شر نہیں ہے، اور مقدور

جو امرِ مقدر ہے، خیر یا شر ہو سکتا ہے، مخلوق میں شر کا موجود ہونا کئی حکمتوں کی بناء پر ہے: ایک حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ اس شر کے ذریعے خیر کو پہچانا جائے، کہا جاتا ہے: وبضدھا تتبین الأشیاء یعنی: اشیاء، اپنی اضداد کے ساتھ عیاں ہوتی ہیں۔ دوسری حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شر کو دیکھ کر لوگ اپنے رب کی طرف لاچار ہوں۔ تیسری حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ سچی توبہ کی طرف آمادہ ہو جائیں۔ اسی لئے دنیا میں موجود شرور سے حفاظت کیلئے ہم صبح و شام اذکار کرتے رہتے ہیں، اور ایسے اوراد کا اہتمام کرتے ہیں جو ہمیں شرور سے محفوظ رکھنے کا سبب بن جائیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ کا ہر فعل خیر ہے، بندہ اگر اس حقیقت کو دل و جان سے پہچان کر قبول کرلے تو ہر مقدور پر اسے تسلی حاصل رہے گی، اگر کسی مقدور کا ظاہر شر ہو گا تو وہ یہ یقین رکھے گا کہ اس کا انجام خیر ہی ہو گا۔ جو انسان اس طرح تقدیر کے ساتھ راضی ہو گیا وہ ہر غم سے نجات پا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بہت ہی قابلِ غور ہے: فرمایا: (المؤمن القوی خیر وأحب إلی اللہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیر، إحرص علی ماینفعک واستعن باللہ ولا تعجز، وإن أصابک شئ فلا تقل لو أنی فعلت کذا لکان کذا، فإن لو تفتح عمل الشیطان)[1] یعنی: طاقت ور مؤمن، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمزور مؤمن سے زیادہ بہتر اور محبوب ہے، سب میں خیر موجود ہے، تو اس چیز کی حرص کر جو تجھے نفع دے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر، اور عاجز اور کمزور نہ بن (اس کے بعد) اگر تجھے کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس طرح مت کہہ: اگر میں نے یوں کرلیا ہوتا تو یوں ہو جاتا؛ کیونکہ اگر اگر کہنا، شیطان کے عمل کو کھولتا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفع بخش چیزوں کی حرص کی تعلیم دی ہے، چنانچہ اس کیلئے جد وجہد کی جائے، اس کے باوجود اگر نقصان ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کا فعل قرار دیکر اور یہ سوچ کر مطمئن ہو جائے کہ اس میں ضرور خیر کا پہلو موجود ہے۔ واضح ہو کہ قوی مؤمن سے مراد وہ شخص نہیں جو جسمانی اعتبار سے طاقت ور ہو، بلکہ اس سے مراد قوی الایمان شخص ہے۔ بہرحال شر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہے؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (والشر لیس إلیک) بلکہ مخلوقات کی طرف منسوب ہے کمافی قولہ تعالیٰ: [قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ] ایک سوال باقی رہ گیا کہ مخلوقاتِ شریرہ کی خلق وتقدیر میں کیا حکمت ہو سکتی ہے؟ جواب: بہت بڑی حکمت ہے، اگر مخلوقاتِ شریرہ کا وجود نہ ہوتا تو ہم مخلوقاتِ خیر کی قدر نہ پہچان پاتے، مثال کے طور پہ بھیڑیا، چھوٹے سے جسم کا ایک جانور ہے، اونٹ کے مقابلے میں تو بہت ہی چھوٹا ہے، مگر وہ انسان کو کھا جاتا ہے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا:

[وَاَخَافُ اَنْ يَّأْكُلَهُ الذِّئْبُ]یعنی: میں ڈرتاہوں کہ اسے (یوسف علیہ السلام) بھیڑیا نہ کھاجائے۔ جبکہ اونٹ کبیرالجسم ہونے کے باوجود انسان کو نہیں کھاتا بلکہ ایک چھوٹا بچہ بھی اسے ہانک کرلے جاسکتاہے۔ اب یہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر غور کیجئے، جواونٹ اور بھیڑیے دونوں کا خالق ہے، بھیڑیا جو ایک مخلوق ہے اس کے اندر موجود شر کا مادہ جب دیکھتے ہیں تواس سے بڑی مخلوق یعنی اونٹ کے اندر موجود خیر کے مادہ کی قدر معلوم ہوتی ہے، نیز حکمتِ الٰہیہ بھی سمجھ میں آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی اونٹ کے متعلق ہمیں تدبر کی دعوت دی ہے، فرمایا: [اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ]یعنی: کیا یہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیاہے۔ تمام امور ہمارے پروردگار کے ہاتھ میں ہیں، کائنات میں موجود ہر شئ اُسی کی قدرتِ کاملہ کا شاہکار ہے۔

(۲۱) حدیثِ جبریل سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ رب العزت کے پاس ہے؛ کیونکہ ملائکہ میں سب سے افضل ہستی جبریلعلیہ السلامنے، انبیاءِ کرام میں سے سب سے افضل شخصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے وقوع کے بارہ میں پوچھا، توانہوں نے ارشاد فرمایا: (ماالمسئول عنها بأعلم من السائل)یعنی: قیامت کے وقوع کے بارہ میں مسئول، سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ اب اگر کوئی بھی شخص اپنے مزعومہ قرائن کی روشنی میں قیامت کے قائم ہونے کے وقت کا دعویٰ کرتاہے یااس دنیا کی عمر کے تعین کی جسارت کرتاہے تووہ جھوٹاقرار دیاجائے گا، بلکہ اس کی یہ جسارت موجبِ کفر ہوگی؛ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہراً تکذیب کا پہلو موجودہے، بلکہ جو شخص ایسے لوگوں کی تصدیق کربیٹھتاہے وہ بھی مرتکبِ کفرہے۔ والعیاذ باللہ

(۲۲) قیامت کی عظمت وہیبت کا بھی علم ہوا، وہ اس طرح کہ قیامت قائم ہونے سے قبل بڑی بڑی علامات رونماہونگی، یہ قیامت کی ہیبت کی دلیل ہیں، نیز یہ علامات انسانوں کو لمحۂ فکریہ مہیاکرتی ہیں کہ اب بھی دنیاسے کنارہ کشی اختیار کرکے آخرت کی تیاری پر توجہ دو۔

(۲۳) جب کسی شئ کا علم نہ ہو تواس کی نشانیوں کی بابت سوال کیا جاسکتاہے، جیساکہ جبریلعلیہ السلامنے [أخبرني عن أماراتها] کہہ کر قیامت کی علامات کا سوال کیا تھا۔

(۲۴) حدیثِ جبریل میں قیامت کی دو علامتوں کا ذکر ہے، جن کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے، فلیراجعِالیھا. اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی دوسری علامات کا ذکر کیوں نہ فرمایا؟ تواس کا جواب یہ ہے کہ دوسری علامات بالکل واضح ہیں، جن کیلئے سوال کی حاجت نہیں ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام انتہائی جامع ومانع ہوتا تھا، لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصراًان دو علامات کے ذکر پر اکتفاء فرمایا، دیگر احادیث میں قیامت کی بہت سی علامات مذکور ہیں، جنہیں کتبِ حدیث میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(۲۵) جبریل امین علیہ السلام اپنے سوالات کے مکمل جوابات لیکر روانہ ہوگئے، جس کا ذکر حدیث میں ان لفظوں کے ساتھ ہے: [ثم انطلق] یعنی: پھر جبریل چلے گئے، اس سے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ فرشتے جب انسانی شکل میں متشکل ہوتے ہیں تو وہ چلتے بھی انسانوں ہی کی طرح ہیں، ورنہ فرشتوں کی اپنی خلقت پَروں کے ساتھ ہے، جن کے ذریعے ان کا آنا جانا، اُڑان کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ] یعنی: اس اللہ کے لئے تمام تعریفیں سزاوار ہیں جو (ابتداءً) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور دو دو تین تین چار چار پروں والے فرشتوں کو اپنا پیغمبر (قاصد) بنانے والا ہے، مخلوق میں جو چاہے زیادتی کرتا ہے اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲۶) اگر طلبۃ العلم پر کوئی علمی نکتہ مخفی رہ گیا ہو تو شیخ کا ازخود اس کی وضاحت کرنا ایک مستحسن امر ہے، وضاحت کیلئے وہ سوالیہ اسلوب بھی اختیار کرسکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین کے چلے جانے کے بعد حاضرین سے یہ سوال کیا تھا (أتدرون من السائل؟) کیا تم جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟ اور یہی سوال امیر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے تقریبا تین دن بعد فرمایا تھا: (أتدری من السائل؟) کیا تم جانتے ہو وہ سائل کون تھا؟ اس سے ثابت ہوا کہ شیخ اپنے طلبۃ العلم کو سمجھانے اور سکھانے کیلئے استفہامیہ اسلوب اختیار کرسکتا ہے۔

(۲۷) جبریل امین علیہ السلام سائل بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے تھے، اور ان کی آمد کا مقصد لوگوں کو ان کا دین سکھانا تھا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: (فانہ جبریل أتاکم یعلمکم

دینکم) یہ جبریل تھے، جو تمہارے پاس آئے تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے کیلئے۔(خود سیکھنے کیلئے نہیں کیونکہ انہیں یہ سب معلوم تھا)اس سے دو بڑے اہم نکتے حاصل ہورہے ہیں: ایک یہ کہ ایک شخص،لوگوں کی موجودگی میں انہیں کوئی چیز سکھانے اور سمجھانے کیلئے شیخ یا مفتی سے سوال کرسکتاہے،جیسا کہ جبریل علیہ السلامنے کیا۔ دوسرا یہ کہ کسی طالب علم کو خواہ ایک مسئلہ معلوم ہو، پھر بھی اس مسئلہ کی بابت اپنے شیخ سے سوال کرسکتاہے، شیخ کے جواب سے اگر دیگر حاضرین بھی مستفید ہورہے ہیں تو وہ سائل بھی ان کیلئے معلم کے مقام پر ہوگا،جیسا کہ جبریلعلیہ السلامکو باوجود سائل ہونے کے، معلم کہا گیا۔

(۲۸) حدیثِ جبریل میں مذکور تمام امور، دین قرار پائیں گے؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:(یعلمکم دینکم) لیکن اس حدیث میں دین کا بیان، بصورتِ اجمال ہے، بصورتِ تفصیل نہیں، تفصیل کیلئے کتاب وسنت کی طرف رجوع ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایاہے:(الدین النصیحۃ)یعنی: دین خیر خواہی کا نام ہے(یہ بات آپ نے تین بار ارشاد فرمائی)اس کے بعد فرمایا:(للہ ولکتابہ ولرسولہ ولأئمۃ المسلمین وعامتھم)[1] یعنی: اللہ تعالی کیلئے،اور اس کی کتاب کیلئے اور اس کے رسول کیلئے اور مسلمان حکام کیلئے اور عامۃ الناس کیلئے۔ حدیثِ جبریل میں مذکور تمام امور بہترین خیر خواہی ہیں، جبریل علیہ السلامکی طرف سے بھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی۔

(۲۹) حدیثِ جبریل سے حاصل ہونے والا اہم ترین فائدہ جبریلعلیہ السلامتمام انبیاء کرام کے امینِ وحی تھے،اور ہمارے آخری نبی اکرم الخلائق، سید البشر محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی امین وحی تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: [نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۔ عَلٰي قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ]اسے امانت دار فرشتہ (جبریل علیہ السلام) لے کر آیاہے آپ کے دل پر اترا ہے کہ آپ آگاہ کردینے والوں میں سے ہوجائیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا دین، دینِ وحی ہے، جو جبریلعلیہ السلامکی وساطت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، یہ دونوں حقیقتیں سورۂ نجم کے شروع میں بیان ہیں: **جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:**[وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَاِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى] **یعنی:** اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے اسے پوری طاقت والے فرشتے نے سکھایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کا زمانہ تئیس سال کے عرصہ پر محیط ہے، ہر وحی جبریل علیہ السلام لیکر آئے، اور اس وحی میں ان کی حیثیت مفتی اور معلم کی ہوتی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طالب اور سامع کی حیثیت سے اس وحی کا سماع فرماتے اور پھر صحابہ کرام کے سامنے بیان فرمادیتے۔ لیکن آج جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں ایک بالکل جدا اور منفرد شکل میں تشریف لائے، معلم بن کر نہیں بلکہ سائل بن کر، اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی موجودگی میں ایک معلم اور مفتی کے بطور ان کے سوالات کے جوابات ارشاد فرمارہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے ؟آج جبریل علیہ السلام بطورِ معلم، تعلیم کیوں نہیں دے رہے ؟رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیوں کررہے ہیں؟ اس کی بنیادی وجہ واللہ اعلم یہ ہوسکتی ہے کہ آج کی تعلیم کا سارا معاملہ صحابہ کرام کے سامنے ہورہاہے، لھذا جبریل علیہ السلام بطورِ معلم نہیں، بطورِ سائل پیش ہوئے، اس میں یہ تنبیہ ہے کہ لوگوں کے سامنے امورِ دین میں گفتگو کا حق صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہے، لوگوں کی موجودگی میں جبریل علیہ السلام بھی بطورِ سائل ہی تشریف لائیں گے۔ یہ حدیث اس پہلو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ ومقام متعین کرتی ہے، جو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی امت کے افراد کے مابین تشریف فرماہوں تو کوئی شخص خواہ وہ جبریل امین ہی کیوں نہ ہو بطورِ مفتی یا معلم پیش نہیں ہوسکتا، لوگوں کے سامنے یہ حق صرف امام الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ یہی فکرِ اہل حدیث ودعوتِ اہل حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی موجودگی میں کسی مجتہد یا مفتی کا فتویٰ یا قول نہیں چل سکتا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عمل یا پاکیزہ فرمان کے مقابلہ میں کسی کا قول وقرار پیش کرنا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے، اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے تمام لوگوں کو اور بالخصوص اصحابِ مذاہب کو اپنی روش اور کردار کا جائزہ لینا چاہئے، ضروری ہے کہ ہمارا منہج اور کردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا آئینہ دار ہو: (كل أ متى يد خلون ا لجنة الا من أبى، قا لوا: يا رسول الله! ومن يأبى ؟ قال: من أ طا عنى دخل ا لجنة ،ومن عصا نى فقد أبى) ترجمہ: میری پوری امت جنت میں داخل ہوگی علاوہ اس شخص کے جس نے جنت میں داخل ہونے سے خود انکار کردیا ہو، صحابہ نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں داخل ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے ؟تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے میری اطاعت کی وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کردیا۔

(۳۰) حدیثِ جبریل پر تھوڑا سا تامل کرنے والے پر یہ نکتہ آسانی سے عیاں ہو جائے گا کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی، اللہ تعالیٰ کی وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے تعلق سے حسنِ اہتمام کی توفیق ارزاں فرمادے، اور یہ توفیق بھی عطا فرمادے کہ ہمارے ظاہر و باطن کے جملہ اعمال پر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنتوں کی چھاپ ہو، ہماری زندگی بھر کے اوڑھنے اور بچھونے کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہوں، تمام عبادات بلکہ عادات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا رنگ ہو، اور پھر اس اتباع کا صلہ بھی عطا فرمادے، جو اس آیت کریمہ میں موجود ہے: [قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ] یہ صلہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور گناہوں کی بخشش سے عبارت ہے۔ والتوفیق بید اللہ تعالیٰ وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وأصحابہ وأھل طاعتہ أجمعین.